۸ر ستمبر ۱۹۷۱ء

ہفتہ وار
ہماری زبان

جلد ۳۰ | ایڈیٹر: آل احمد سرور | شمارہ ۳۴

اس شمارے میں

اداریہ

اترپردیش میں اردو کے لئے کیا ہو؟

(۲)

جہاں تک کالجوں میں اردو کی تعلیم کا سوال ہے، ہم جانتے ہیں کہ اترپردیش میں کالجوں کی تعلیم بیشتر پرائیویٹ اداروں کے ہاتھ میں ہے۔ مگر یہاں بھی حکومت کا رویہ ہمدردانہ ہو تو بہت کچھ ہو سکتا ہے۔ اچھی تعلیم کا اصول یہ ہے کہ جو کوئی کسی مضمون کو پڑھنا چاہے، اس کا انتظام کرنا چاہئے۔ آئے دن ہمارے پاس خبریں آتی رہتی ہیں کہ خاصی تعداد میں طلبہ نے اردو کی تعلیم کا انتظام کرنے کے لئے پرنسپل یا منیجر کو درخواستیں دیں، مگر ان لوگوں نے کوئی توجہ نہ کی۔ پہلی بات یہ ہونا چاہئے کہ حکومت تمام سرکاری انٹر کالجوں اور تمام سرکاری ڈگری کالجوں میں اردو کی تعلیم کا جلد سے جلد مناسب انتظام کرے۔ دوسرے اگر پرائیویٹ کالجوں کے طلبہ اردو ایک اختیاری مضمون کی حیثیت سے لینا چاہیں تو حکومت اس کے لئے مزید امداد دے۔ اب بھی پرائیویٹ اداروں کو حکومت گرانقدر امداد دیتی ہے۔ کوئی وجہ نہیں کہ اردو پڑھانے کے لئے مزید امداد نہ دی جائے۔ دوسرے ملکوں میں کوئی ادارہ یہ عذر نہیں کرتا کہ وہ کسی مضمون کی تعلیم کا انتظام نہیں کر سکتا۔ اگر چند طلبہ بھی مطالبہ کریں تو اس مضمون کی تعلیم کا انتظام کیا جاتا ہے۔ بہت سی یونیورسٹیوں سے اردو کے ایم۔ اے ہر سال نکلتے ہیں۔ انھیں آسانی سے کالجوں میں ملازم رکھا جا سکتا ہے۔ کتابوں کا مسئلہ مرکزی حکومت کا ترقی اردو بورڈ حل کر رہا ہے۔ اگلے سال تک آرٹس اور سائنس کے بیشتر مضامین کی معیاری کتابیں تیار ہو جائیں گی اور ان میں سے کچھ چھپ بھی جائیں گی۔

تعلیم کے علاوہ بہت سے اور بھی مسئلے ہیں جن پر آسانی سے توجہ ہو سکتی ہے۔ حکومت کہتی ہے کہ اب عدالتوں اور دفتروں میں درخواستیں اردو میں دی جا سکتی ہیں، رجسٹری اردو میں ہو سکتی ہے، اردو گزٹ شائع ہو رہا ہے۔ کچھ اضلاع میں اردو میں حکومت کے احکام کی پبلسٹی ہوتی ہے۔ انتخاب کے موقع پر چند جگہوں پر اردو میں انتخابی فہرستیں تیار کرائے جانے کی بھی خبر ملی تھی، مگر ضرورت یہ ہے کہ ان تمام علاقوں میں جہاں اردو بولنے والوں کی اچھی آبادی ہو، انتخابی فہرستیں اردو میں ضرور تیار ہونی چاہئیں۔ جب انتخاب کے موقع پر

فی کاپی: ۱۵ پیسے
قیمت سالانہ: ۵ روپے

انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ

اشاعت کی تاریخیں
۱، ۸، ۱۵، ۲۲

ہر پارٹی اردو میں اپنا لٹریچر چھپواتی ہے، اردو میں اخبار نکالتی ہے، اردو میں پوسٹر شایع کرتی ہے تو حکومت انتخابی فہرستیں بھی شایع کر سکتی ہے۔ اسی طرح شاہراہ عام پر اردو میں ہدایات بھی لکھوا سکتی ہے۔ اس سے ہندی کی اہمیت کم نہیں ہوتی۔ ہاں ان لوگوں کو جو اردو رسم خط کے عادی ہیں سہولت ہوتی ہے۔ ہر اچھی حکومت کو یہ سہولت دینی چاہیے۔ اگر کسی اقلیت کو جبر یا زبردستی کا احساس ہو تو یہ جمہوریت کے منافی بات ہے۔

اس وقت اتر پردیش میں کتب خانوں کا ایک جال بچھا ہوا ہے مگر ان میں اردو کی کتابیں بہت کم ہیں۔ حکومت کو چاہیے کہ اردو کی کتابیں بھی خاصی تعداد میں خریدے اور ان تمام کتب خانوں میں جہاں اب تک صرف ہندی کی کتابیں بھیجی جاتی رہی ہیں، اردو کی کتابیں بھی بھیجے۔ آخر اردو بھی اس ریاست کی ایک اہم زبان ہے۔ کوئی وجہ نہیں کہ حکومت اردو کی کتابیں کتب خانوں کے لئے کثیر تعداد میں خرید کر تقسیم نہ کرے۔ ہندی کا حق مسلّم، مگر آخر اردو کا بھی تو اس ریاست پر حق ہے۔ اس کی طرف سے غفلت کیوں۔

اتر پردیش کی سکریٹریٹ کا فرض ہے کہ وہاں جو خط اردو میں آئیں ان کا جواب اردو میں دیا جائے۔ ہندی کی نقل ساتھ میں ہو تو بھی کوئی حرج نہیں۔ اس کام کے لئے سکریٹریٹ میں اردو کے ٹائپسٹ رکھنے ہوں گے اور ٹائپ رائٹر منگانے ہوں گے مگر دونوں کا انتظام آسانی سے ہو سکتا ہے۔

اردو کے ادیبوں کی ہمت افزائی ہو رہی ہے مگر اس پر اور زیادہ رقم صرف کرنی چاہیے۔ اردو ادب بہر حال ہندوستانی ادب ہے۔ اردو کے ادیب بہر حال اپنے طور پر مسرت اور بصیرت کا خزانہ عام کر رہے ہیں۔ اردو کے ادیبوں اور شاعروں کو انعامات اور زیادہ دینے چاہئیں۔

سارے مقابلے کے امتحانوں میں اردو ایک اختیاری مضمون کی حیثیت سے ضرور ہونی چاہیئے۔

اتر پردیش کی حکومت آسانی سے یہ سب کام کر سکتی ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ وہ واقعی کیا کرتی ہے۔ صرف وعدوں سے اب کام نہیں چلتا۔

(صفحہ ۱۱ سے آگے)

ہیں تو ادب کو اس کا یہ جمہوری حق بھی ملنا چاہیے کہ اسے دوسرے علوم کی کنیز یا لاحقہ نہ سمجھ کر ایک مستقل بالذات فن سمجھا جائے۔ اسی صورت میں تنقید صرف ٹوپیوں کی بجائے پورے بدن کو دیکھ سکتی اور اسے فن کے پیرہن سے آراستہ کر سکتی ہے۔ اگر نقاد فن کو بھی ملحوظ رکھے محض اپنی علمیت کا مظاہرہ نہ کرے تو فنکار کو بھی اس کے نشتر سے کوئی بدگمانی نہ ہوگی۔

اور جن خامیوں یا کوتاہیوں کی طرف اشارے کئے گئے وہ ہماری تنقید اور تنقیدی رویّوں کی کوتاہیاں ہیں جن سے کوئی سیمینار اس وقت تک آزاد نہیں ہو سکتا جب تک کہ ہماری تنقید پوری طرح بالغ نہ ہو جائے اور ادب پر رائے دینے والے ادب کے آداب کو پوری طرح سمجھنے نہ لگیں۔

اس سیمینار کا تکملہ "شب افسانہ" کی ان دو نشستوں سے ہوتا ہے جن میں جدید علامتی اور تجرباتی افسانے پڑھے، سنے اور پسند کئے گئے۔ پہلی نشست میں شرون کمار ورما، سریندر پرکاش، بلراج مین را، رام لعل اور جوگندر پال نے افسانے سنائے۔ دوسری نشست میں اقبال مجید، دیوندر اسّر، انور عظیم اور حیات اللہ انصاری نے اپنی تخلیقات سنائیں۔ نسبتاً جدید افسانہ نگاروں کو جن کا طرزِ اظہار علامتی ہے اور جو افسانے کے ہیئت و موضوعات میں نئے تجربے کر رہے ہیں، نہ صرف توجہ سے سنا گیا بلکہ بہت پسند بھی کیا گیا۔ اس سے بعض حلقوں یا نقادوں کا بنایا ہوا یہ طلسم بھی پاش پاش ہو جاتا ہے کہ جدید افسانہ یا فن ابلاغ و ترسیل کی سطح پر ناکام رہتا ہے۔

اس کامیاب سیمینار کے انعقاد پر جو تنقید اور تخلیق دونوں اعتبارات سے کامیاب بھی رہا اور ادب کی نئی جہتوں کا اشاریہ بھی ثابت ہوا، علی گڑھ کا شعبۂ اردو قابل مبارکباد ہے، کاش دوسری یونی ورسٹیاں بھی علی گڑھ کے شعبۂ اردو کی اس راہ کو اپنا کر ہم عصر ادب اور اس کے توسط سے اپنے پورے ادبی سرمایہ کا عرفان و ذوق عام کرنے میں حصہ لیں۔

متین سہیل

اردو ڈرامے کے مسائل

اردو میں ڈرامے کی تاریخ بڑی لمبی ہونے کے باوجود بہت مختصر ہے۔ اردو ادب میں ڈرامہ کی نشوونما اس دور میں ہوئی جب تمدن اور ادب کا باہمی رشتہ استوار ہونا شروع ہوا لیکن یہ ایک افسوسناک حقیقت ہے کہ ادب کی اتنی قدیم صنف ہونے کے باوجود ڈرامہ کی صنف ہمیشہ بے توجہی کا شکار رہی۔ ادبی مباحث میں ڈرامہ کی عدم مقبولیت اور اس صنف کی طرف قلمکاروں کے تجاہل عارفانہ کے متعلق کئی مرتبہ اظہار خیال کیا جا چکا ہے لیکن ڈرامہ کے ارتقاء کی سست رفتاری اور اس کے پس منظر میں پوشیدہ مسائل پر سنجیدگی سے بہت کم غور کیا گیا ہے۔ ہمارے ناقدین بھی اس صنف کے متعلق خامہ فرسائی سے حتی الامکان گریز ہی کرتے رہے ہیں۔

ڈرامہ کی صنف کو آج بھی ہمارے ادب میں وہ اہمیت حاصل نہیں ہے جس کی وہ بجا طور پر مستحق ہے۔ یہاں تک کہ صحیح معنوں میں اس کے ادبی مقام کا بھی تعین نہیں ہو پایا ہے۔ ڈرامہ، اردو کی سب سے زیادہ "بدقسمت" اور سب سے کم ترقی یافتہ صنف بن کر رہ گئی ہے۔

ڈرامہ کے مسائل پر غور کرتے ہوئے سب سے پہلا سوال ذہن میں یہی اٹھتا ہے کہ اردو میں ڈرامے خاطر خواہ تعداد میں کیوں نہیں لکھے گئے ہمارے ادب میں اب تک کوئی شیکسپیئر کوئی مارلو کیوں نہیں پیدا ہوا؟

اردو ادب کی دیگر اصناف کی طرح ڈرامہ کو فارسی ادب کا سہارا ابھی نہیں ملا۔ کیونکہ فارسی میں اس صنف کا کوئی سرمایہ موجود نہ تھا۔ سنسکرت اور دوسری ہندوستانی زبانوں کے ادب میں ڈرامہ کی صنف اردو کے ارتقاء سے پہلے ہی اپنی قدر و قیمت کھو چکی تھی۔ لہٰذا یہ صنف اس وقت تک اپنے مستحکم وجود کی منتظر رہی، جب تک کہ نئی تہذیب و تمدن نے غیر ملکی ادب سے ہمیں آشنا نہ کیا۔

اردو میں ڈرامہ کی ابتداء یوں تو واجد علی شاہ کے عہد میں ہوئی لیکن عرصہ تک ڈرامہ، رہس اور ناٹک کی حد سے آگے نہیں جا پایا۔ اس کا مقصد محض تفریح تھا اس کی ادبی حیثیت کچھ نہ تھی۔ اس دور کے بیشتر ڈرامے مذہبی قصوں اور حکایتوں پر مبنی ہوتے تھے۔ طنزیہ ڈرامے اس دور میں عنقا تھے۔

سید آغا حسین امانت لکھنوی نے اردو کا پہلا طنزیہ ڈرامہ "اندر سبھا" ۱۲۶۸ھ میں تحریر کیا۔ امانت کی "اندر سبھا" سے امتیاز علی تاج کی "انارکلی" تک اردو ڈرامہ کی تاریخ میں ایک "خلاء" کا سا احساس ہوتا ہے۔ پارسی تاجرین کے ایماء پر تھیٹریکل کمپنیوں کے لئے یوں تو کئی ڈرامے تحریر کئے گئے لیکن ہم انھیں ادبی حیثیت دینے میں پس و پیش محسوس کرتے ہیں۔ اگر انھیں ادب کے زمرہ میں شامل کیا بھی جائے تو زیادہ سے زیادہ "تفریحی ادب" کا درجہ دیا جا سکتا ہے۔

اس طرح اگر ہم غور کریں تو "انارکلی" سے پہلے اردو ڈرامہ کا ارتقاء برائے نام رہ جاتا ہے۔ امتیاز علی تاج کی یہ تخلیق ڈرامہ کے فن کی کسوٹی پر پوری اترنے والی، اردو کی پہلی تخلیق کہی جا سکتی ہے۔ "انارکلی" کے بعد اردو کے قلمکار اس صنف کی طرف تدریجاً متوجہ ہوئے۔ لیکن عرصہ تک ڈرامہ تکنیکی اعتبار سے ہمارے ادب میں ایک ادھوری صنف رہا۔

اسٹیج ڈراموں اور پارسی تھیٹر کا دور میری دانست میں ڈرامہ کے تنزل کا دور ہے ارتقاء کا نہیں۔ ڈرامہ اسلامی عہد حکومت کے دور انحطاط کی پیداوار ہے ابتدائی دور ہی سے

کرامت علی کرامت

غزل

جو نقوش ابھرے ہیں احساس کے آئینے میں
مٹ سکے خونبار نہ ہوں یاس کے آئینے میں

جس کو امید کے پردے پہ کبھی دیکھا نہ کبھی
وہی آتا ہے نظر یاس کے آئینے میں

دل کی تسکین کی خاطر نہیں کم موجِ سراب
دیکھئے اس کو ذرا پیاس کے آئینے میں

کیوں گنہ سے نہ منور ہو ضمیرِ انساں
کوئلہ چمکے ہے الماس کے آئینے میں

سنگِ امروز سے فردا کو بچاؤں کیسے
بال جب پڑ ہی گیا آس کے آئینے میں

اپنی ہی شکل کی اک شے نظر آئے گی تمہیں
گر مجھے دیکھو گے دشواس کے آئینے میں

یہ صنف انتشار اور انحطاط کا شکار رہی۔ گویا اس کی بنیاد ہی کھوکھلی تھی۔ پھر اس صنف میں کسی شاہکار کے تخلیق پا جانے کی اتنی جلد امید کرنا فضول ہی ہے۔

اندرسبھائی عہد سے اب تک اردو ڈرامہ کئی دشوار منزلوں سے گذرا لیکن اسے ثبات اور وقار، اب تک حاصل نہ ہو سکا۔ اس کی کئی وجوہات ہیں۔ قلمکاروں کی بے توجہی کی اصل وجہ اس صنف کی عوام میں عدم مقبولیت ثابت ہوئی۔ اسٹیج ڈراموں کے زوال اور صنعت فلم سازی کے ارتقا نے مزید تازیانہ کا کام کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ڈرامہ کی ترقی یافتہ شکل یعنی "فلم" تو ترقی کی منزلیں طے کرتی گئی لیکن اسٹیج ڈراموں کی غیر مقبولیت کے ساتھ ساتھ ادبی ڈرامہ بھی تنزل پذیر ہوتا گیا۔

ڈرامہ کی ادبی و فنی حیثیت میں عدم توازن کا سبب یہ بھی ہے کہ برصغیر میں ڈرامہ تجربہ ہی رہا، روایت نہ بن سکا۔ اس نے ادب کی ترقی کی رفتار کا ساتھ دیگر اصناف کی طرح نہیں دیا۔ نہ ایسی قدریں چھوڑیں، جو ہمارے لیے فخر کا باعث ہوتیں۔ حالانکہ ڈرامہ انگریزی ادب کی قدیم ترین اصناف میں سے ایک ہے۔

عالمی ادبی تاریخ کے بعض ادوار کو چھوڑ کر ڈرامہ ہر دور میں انسانی ذہن و جذبات کی ترجمانی کے باوجود ادب کا مزاج نہ بن سکا۔ خصوصاً اردو ادب کے رنگ و آہنگ سے اس کا مزاج عرصہ تک نہیں مل پایا۔ آغا حشر تک کے ڈرامائی ادب کا سرمایہ زیادہ تر تفریحی سطح تک ہے۔ زندگی کی عکاسی اس دور تک ڈرامہ کے فن میں داخل نہیں ہوئی تھی۔ کہانیوں میں پلاٹ ڈھونڈھے نہ ملتا، مکالمے حد درجہ سستے اور عامیانہ استعمال کئے جاتے۔ کہانیوں میں دیومالاؤں کی عکاسی کو باعث فخر سمجھا جاتا۔ ڈرامہ کا موضوع یا تو قدیم داستانوں اور مثنویوں کے واقعات ہوتے یا مذہبی حکایتیں۔ ڈرامہ عرصہ تک پریوں، جنوں، دیوتاؤں اور دیومالاؤں کے ذہنی قصوں کے حصار میں محصور رہا۔ حقیقت کی بجائے فرار، اس صنف کی روح بنا رہا۔

آغا حشر نے اردو میں ڈرامہ کی مٹتی ہوئی روایت کو کسی حد تک نئی زندگی دینے کی کوشش کی لیکن اردو ڈرامہ میں تنوع اور تازگی کی کمی جو ابتدائی دور سے عصر حاضر تک محسوس ہوتی ہے۔ آغا حشر کی فلموں سے وابستگی کے بعد اردو کے اسٹیج ڈراموں کا دور تقریباً ختم ہو گیا۔ یہاں تک کہ تاج کا ڈرامہ "انار کلی" ادبی لحاظ سے مقبول ہونے کے باوجود، اسٹیج پر کامیاب نہ ہو سکا۔

آغا حشر کو اردو ڈرامہ کو سب سے زیادہ قدآور شخصیت تسلیم کیا جاتا ہے لیکن انھیں بھی اردو کے عظیم ادیبوں میں شمار نہیں کیا جاتا۔ ڈرامہ کی صنف کے علاوہ ہمارے یہاں ڈرامہ نویس بھی ہمیشہ عظمت سے محروم ہی رہے۔ یا تو وہ فنی اعتبار سے واقعی اس لائق نہیں ہیں یا ہمارے ناقدین نے سنجیدگی سے ان کے فن کو پرکھا نہیں ہے۔ وجہ کچھ بھی ہو، اردو میں ڈرامہ کی روایت نہایت ضعیف ہے۔ گنے چنے چند ڈرامے ہمارے ادب کا کل سرمایہ ہیں۔ مثلاً خواجہ احمد عباس کا "یہ امرت ہے" "زبیدہ" "ایٹم بم" کرشن چندر کا "ہائیڈروجن بم کے بعد" حکیم احمد شجاع کا "باپ کا گناہ" ڈاکٹر عابد حسین کا "زود پشیمان" اور "پردۂ غفلت" اور حبیب تنویر کا "آگرہ بازار" وغیرہ۔ مغربی ادب کے تراجم کے علاوہ طبعزاد ڈرامے بھی ہمارے کئی اہم قلمکاروں نے تصنیف کئے۔ مثلاً کرشن چندر، احمد عباس، منٹو، دیویندر ناتھ اشک، ممتاز مفتی، ڈاکٹر عابد حسین، صالحہ عابد حسین، اشتیاق حسین قریشی، ابراہیم جلیس، پرکاش پنڈت، ڈاکٹر محمد حسن، ابراہیم یوسف، منجو قمر، رضیہ فصیح احمد، سلیم احمد، بانو قدسیہ اور اصغر بٹ وغیرہ کے تصنیف کردہ ڈرامے فنی لحاظ سے مکمل ہیں۔ ان تمام مصنفین کے تحریر کئے ہوئے ڈرامے "معمولی" سے "غیر معمولی" کی حد تک تو پہنچ پائے لیکن "عظیم ادب" کے دائرے میں شامل نہیں ہو پائے۔

ریڈیائی ڈراموں کے فروغ نے اس صنف کو کچھ سہارا دیا ہے اور قلمکاروں کو کسی حد تک اس صنف کی طرف متوجہ کیا ہے۔ لیکن تعمیری ادب کے دامن میں عظیم ڈراموں کا اب تک خاطر خواہ اضافہ نہیں ہوا ہے۔ یہ کمی تشویشناک بھی ہے اور غور طلب بھی۔ اردو ڈرامہ آج بھی عظمت کی تلاش میں ہے۔

ڈاکٹر سید احتشام احمد ندوی

ادبی شہرت کا
نفسیاتی مطالعہ

انسان بنیادی طور پر شہرت کا بھوکا ہے خاص طور سے وہ لوگ جو بلند عزائم رکھتے ہیں اور حوصلہ مند ہیں اکثر حصول شہرت کے لئے ایسے امور کے مرتکب ہوتے ہیں جن سے ان کا کردار مجروح ہوتا ہے۔ ادب کی منجملہ بہت سی مشکلات میں سے ایک اہم مشکل ادبی شہرت ہے اسی کی وجہ سے ادبا و شعرا اخلاقی جرائم کے مرتکب ہوتے ہیں توقع کے مطابق شہرت حاصل نہ ہونے پر ان کے اندر غیظ و غضب پیدا ہوتا ہے کبھی وہ اس کے حصول کے لئے مکر و فریب اور جھوٹ کی راہ بھی اختیار کرتے ہیں۔ کبھی اپنی ذات میں کسی خصوصیت کی کمی محسوس کرکے کوئی بات گڑھ بیٹھتے ہیں چنانچہ غالب کو خیال آیا کہ لوگ ان کو "بے استادا" کہتے ہیں اس لئے انھوں نے ایک شخصیت "ملا عبدالصمد" کے نام سے گڑھ لی تاکہ لوگ یہ نہ کہیں کہ ان کا کوئی استاد نہ تھا۔[1]

کارلائل کا خیال ہے کہ جان جاک روسو ادبی شہرت کا مریض تھا اس کو مدح و ستائش کی بھوک تھی۔ ایک بار اس کو ایک ڈرامہ دیکھنے کے لئے بلایا گیا تو اس نے کہا کہ میں بھیس بدل کر اس طرح آؤں گا جیسے بادشاہ نکلتے ہیں تاکہ لوگ مجھے پہچان نہ سکیں۔ جب وہ ہال میں جاکر اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا تو لوگ تاڑ گئے کہ یہ روسو ہے مگر کسی نے اس کی جانب التفات نہ کیا اور نہ کسی نے اس کو سلام کیا۔ روسو نہایت غضبناک ہوا اور اس کی طبیعت مکدر ہوگئی۔ جن لوگوں نے اس کو بلایا تھا وہ سمجھ گئے کہ لوگوں کے پہچان لینے سے وہ خفا نہیں ہوا بلکہ اس کا سبب یہ ہے کہ کسی نے اس کو پہچاننے کے بعد بھی سلام نہ کیا۔ کارلائل کہتا ہے کہ در اصل روسو کو اس کا بہت شوق تھا کہ جمہور میں اس کو مقبولیت اور شہرت حاصل ہو۔

اسی طرح گوئٹے اور بیتھوون کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ دونوں ساتھ راستے سے گزرتے جب کوئی سلام کرتا تو دونوں میں سے ہر ایک سمجھتا کہ یہ میری عظمت و ہیبت کے پیش نظر مجھے سلام کرتا ہے۔

شہرت کوئی بری شے نہیں۔ انانیت کم و بیش ہر انسان کے اندر موجود ہے اور فطری امر ہے مگر حصول شہرت کے لئے غیر اخلاقی طریقے اختیار کرنا شخصیت کو مجروح کر دیتا ہے۔ ہمارے علمائے سلف تو اس قدر محتاط تھے کہ وہ ایسی بہت سی معروف و متداول کتابیں لکھ گئے ہیں جن کے مصنفین کا نام کسی کو معلوم نہیں۔ انھوں نے ایسا شہرت سے بچنے کے لئے کیا تاکہ درازی نفس کے باعث ثواب نہ کم ہو جائے۔ شہرت اچھی چیز ہے اگر اچھے معاملے میں ہو اور اس کے لئے وسائل بھی جائز استعمال کئے گئے ہوں۔ غالب کی شخصیت اور شاعری کے درمیان فرق سے قطع نظر ان کا یہ شعر اس موقع پر قابل ذکر ہے۔

عشق و مزدوری عشرت گہ خسرو کیا خوب
ہم کو تسلیم نکو نامی فرہاد نہیں

بدنامی میں بھی نام ہوتا ہے۔ مگر مقصود نیک نامی ہے۔ غلط انتساب، جھوٹ اور دوسرے ذرائع سے حصول شہرت ایک اخلاقی مرض ہے جس میں بہت سے لوگ مبتلا ہیں بعض ادیبوں کو اس کا شوق ہوتا ہے کہ کوئی شعر گڑھ کر دوسروں کی طرف منسوب کر دیں یا کسی کا شعر کسی دوسرے کی جانب منسوب کر دیں جعلسازی میں اس طرز کے گڑھے ہوئے شعر کا رواج اس بنا پر عام ہو گیا کہ جن قبائل کے پاس خاندانی مفاخر کا ساماں نہ تھا انھوں نے اپنے قبیلے کی عظمت کو بڑھانے کے لئے قصے گڑھ کر کسی قدیم شاعر کی جانب منسوب کر دئے۔[2]

اس موقع پر ایک نہایت دلچسپ قصہ ابو عبید اللہ جراح نے کتاب الورقہ میں لکھا ہے کہ عباس بن احنف نے ایک نہایت عمدہ قصیدہ بالکل نئے رنگ میں کہہ کر ہارون الرشید کی خدمت میں پیش کیا۔ ہارون نے دریافت کیا کہ کیا اس سے قبل بھی کسی نے اس انداز کا قصیدہ کہا ہے؟ عباس بن احنف نے کہا کہ نہیں۔ رشید نے حکم دیا کہ اصمعی کو بلایا جائے۔ وہ آیا تو اس سے انھوں نے اس بارے میں دریافت کیا۔ اصمعی بولا کہ اس طرز کے بے شمار قصائد شعرائے متقدمین کے یہاں موجود ہیں مگر اس وقت میں چند منٹ کی مہلت چاہتا ہوں اس لئے کہ آپ کے قاصد نے مجھے "جائے ضرور" سے بلایا ہے۔ میں ابھی لوٹ کر اطمینان سے اس بارے میں سناؤں گا۔ وہ بیت الخلاء گیا وہاں اسی طرز کا ایک قصیدہ گڑھا اور لوٹ کر ہارون الرشید کو سنا دیا۔ جب دونوں باہر نکلے تو عباس نے اصمعی کو قسم دلا کر پوچھا کہ کیا تو نے یہ قصیدہ گڑھ نہیں لیا ہے؟ اصمعی نے اس کا اعتراف کیا۔[3]

---

[1] مقالات خطبات کردہ انجمن اساتذہ جامعات اردو [illegible] ص ۱۵۰

[2] طبقات الشعراء ابن سلام ص ۱۱

[3] کتاب الورقہ مطبوعہ دار المعارف مصر ص ۳۰، ۳۱

خود ہمارا ادب اس طرز کے "انتحال (غلط انتساب) سے کب پاک ہے۔ مولانا محمد حسین آزاد نے مندرجہ ذیل اشعار میر کی طرف منسوب کرکے ان کے بارے میں ایک دلچسپ قصہ گڑھ دیا ہے۔

کیا بود و باش پوچھو ہو پورب کے ساکنو
ہم کو غریب جان کے ہنس ہنس پکار کے
دلی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب
رہتے تھے منتخب ہی جہاں روزگار کے
اس کو فلک نے لوٹ کر ویران کر دیا
ہم رہنے والے ہیں اسی اجڑے دیار کے

مولوی عبدالحق کی تحقیق کے مطابق یہ قطعہ میر کا نہیں بلکہ مصحفی کا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ بات یہ ہے کہ جب ایک شخص نے (اور وہ بھی اگر معتبر ہے) کوئی بات لکھ دی تو سب اسے بغیر تحقیق کے نقل کر دیتے ہیں۔ ایسی کئی مثالیں ہیں مثلاً وہ قطعہ جو میر تقی میر سے منسوب ہے۔

"کیا بود و باش پوچھو ہو پورب کے ساکنو" میر صاحب کے کلام میں کہیں نہیں پایا جاتا اور جو قصہ اسی ضمن میں آزاد نے لکھا ہے وہ بھی غلط ہے۔ اصل میں یہ قطعہ مصحفی کا ہے صرف الفاظ میں کچھ رد و بدل کر دیا گیا ہے[1]۔

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کوئی ناقد بغیر قابل اطمینان دلائل کے کسی کتاب یا کسی مسلمہ مسئلہ پر اظہار شبہات کر دیتا ہے تاکہ ادبی حلقوں میں سنسنی کی فضا پیدا ہو جائے اور اس کے نظریہ کی تردید یا تائید میں مضامین و کتابیں لکھی جائیں اس طرح اس کی شہرت عام ہو۔ عربی میں یہ طریقہ ڈاکٹر طٰہٰ حسین نے اپنایا تھا اور اردو میں نیاز فتح پوری کے یہاں یہ کیفیت ملتی ہے۔

آجکل حصول شہرت کا ایک طریقہ اور نکل آیا ہے اگر کوئی شخص کسی کالج میں یا یونیورسٹی میں کسی شعبہ کا صدر بن گیا ہے تو وہ کسی ماتحت سے مقالے، کتابیں اور کسی ریسرچ اسکالر کی محنت کو غصب کرکے ان تمام چیزوں کو اپنی شہرت کا ذریعہ بناتا ہے ایسا تو اکثر ہوتا ہے کہ ریسرچ اسکالر کو گائڈ کوئی ماتحت کرتا ہے مگر نام صدر شعبہ کا ہوتا ہے۔ اگرچہ یہ باتیں عام نہیں ہیں مگر ان کے وجود میں شبہ بھی نہیں۔

حصول شہرت کی یہ کیفیت مصحفی کے دور میں بھی تھی اس وقت رسالوں اور کتابوں کے بجائے حصول شہرت کا ذریعہ شاعری تھی بقول عظمت اللہ خاں جب ایک شخص دوسرے سے ملتا تھا تو یہ نہیں معلوم کرتا تھا کہ آپ نے تعلیم کہاں تک حاصل کی ہے بلکہ یہ پوچھتا تھا کہ جناب کا تخلص کیا ہے؟[2] مولانا محمد حسین آزاد نے لکھا ہے کہ بڑے بڑے شعراء اپنا کلام بیچ لیتے تھے چنانچہ مصحفی نقلیوں پر غزلیں لکھ کر رکھ دیتے تھے، مشاعرے کے دن بہت سے جاہل کلام خرید کر مقطع میں اپنا نام ڈلوا لیتے تھے۔

اسی طرح کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کوئی غیر معروف مخطوطہ کسی کے ہاتھ لگ گیا تو وہ اسے اپنے نام سے شائع کر دیتا ہے۔ یا اگر کسی کے ہاتھ کسی شاعر کا دیوان آ گیا اور وہ غیر معروف شاعر ہے تو وہ اس کو آسانی سے اپنا لیتا ہے۔ جس طرح بازار میں سرقے ہوتے اور ڈاکے پڑتے ہیں اسی طرح بازار علم میں بھی بدنفس اور نااہل سرقے کرتے ہیں کبھی کامیاب ہو جاتے ہیں اور کبھی پکڑے جاتے ہیں۔ سڈنی نے اپنی کتاب ادبی ناقد میں لکھا ہے کہ تنقید ادبی چوری کو ختم نہیں کر سکتی مگر اس کا کام یہ ہے کہ وہ سرقہ کو اصل حقیقت بننے سے روکے اور اصل کیفیت کو واضح کرے۔[3]

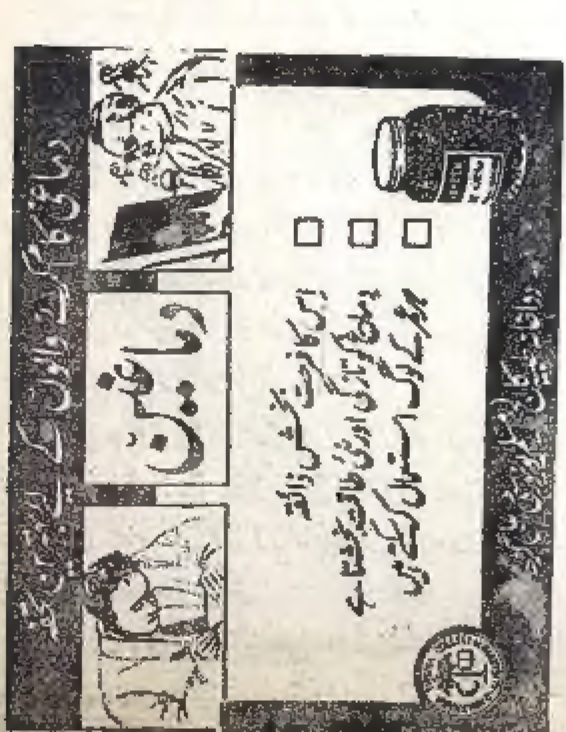
---

[1] مکتوبات عبدالحق مرتبہ جلیل قدوائی ملاحظہ ہو خط بنام مولوی سخاوت مرزا۔

---

[2] مقدمہ سریلے بول از عظمت اللہ خاں

[3] LITERARY CRITICS BY SIDNEY, SEE THE PREFACE



حرف اسلات

اردو تعلیم کا مسئلہ

کرن۔ اندھیرے میں روشنی کی ایک کرن کے طور پر اتر پردیش میں یہ خبریں آنے لگی ہیں کہ اسکولوں میں طلبہ کی قابل لحاظ تعداد ملنے پر اردو کو بحیثیت اختیاری مضمون کے شروع کیا جا رہا ہے۔ لیکن اردو تدریس کا یہ نیا سلسلہ لائق مبارکباد و تشکر ہوتے ہوئے خاص توجہ اور منصوبہ بندی چاہتا ہے اور سرکار کو یہ بھی طے کرنا ہوگا کہ اردو کو دفتری لال فیتہ شاہی کے نذر کرنے کے بجائے ٹھوس اور عملی طریقہ کار اختیار کیا جائے تاکہ قدم قدم پر دقتیں حائل نہ ہوتی رہیں۔

اتر پردیش میں اردو تعلیم کا انتظام صرف زبان کی حد تک نہیں بلکہ پرائمری تک ذریعہ تعلیم کی شکل میں ہونا چاہیے کیونکہ اردو بولنے والی آبادی کی تخلیقی صلاحیت کے نشو و نما کے لئے ان کی نئی نسل کا مادری زبان میں تعلیم حاصل کرنا نہایت ضروری ہے۔ اس بات کی بھی ضرورت ہے کہ اس کو پورے صوبے کے ابتدائی درجات میں دوسری لازمی زبان کی حیثیت سے پڑھایا جائے۔ جو طلبہ چھٹے درجے تک صرف ہندی پڑھتے ہیں ان کو اگر ایک اور زبان کی تعلیم دی جائے تو یہ کوئی بڑا بوجھ نہ ہوگا۔ جبکہ فائدہ یہ ہوگا کہ اردو والے طلبہ کو اپنی مادری زبان کی تعلیم کا موقع مل جائے گا اور دوسری طرف ہندی والوں کو اتنی اردو آجائے گی کہ اپنے پڑوس کی باتوں کو اچھی طرح سمجھ سکیں گے۔ یہ بات باہمی مفاہمت اور قومی مفاد کے لئے ضروری ہے۔

جہاں تک موجودہ اسکیم کا تعلق ہے جو اردو کو اختیاری مضمون کی حیثیت سے جاری کرانے کے لئے چلائی جا رہی ہے اس کے لئے چند ضروری باتیں یہ ہیں۔

۱۔ نصاب کمیٹی کا تقرر کیا جائے جو درجہ ایک سے درجہ پانچ تک کے لئے بدلے ہوئے حالات کے مطابق نصاب تیار کرے، اور کتابیں منظور کرے۔ کیونکہ موجودہ کتب کسی بھی حیثیت سے جدید معیاری تعلیم سے مطابقت نہیں رکھتیں۔

۲۔ اردو مدرسین کے تقرر میں قانونی اور دفتری پابندیوں کو حتی الامکان نرم کر دیا جائے۔ مثلاً مدرسین کے تقرر میں بنیادی شرط ہائی اسکول بی ٹی سی ہے۔ صورت حال یہ ہے کہ بیس سال سے اردو تعلیم کا سلسلہ بڑی حد تک منقطع ہو جانے کی وجہ سے اول تو اردو داں ہائی اسکول بہت کم نکلتے ہیں اور ان میں بھی زیادہ تر بی ٹی سی کی طرف رجوع نہیں ہوتے۔ ڈسٹرکٹ بورڈ وغیرہ میں مدرسی کرنے کے لئے اردو کا مضمون لے کر ٹریننگ کرنا زیادہ مفید نہیں تھا اس لئے اب جب کہ اردو کی تعلیم شروع کی جا رہی ہے اردو کے ٹرینڈ مدرسین کا میسر آنا دشوار ہے۔

بی ٹی سی کی ٹریننگ عام سوشل مضامین کی تعلیم پر زور دیتی ہے اور عام سماجی موضوعات کے پڑھانے کا طریقہ بتلاتی ہے۔ اس میں ایک پرچہ زبان کے بارے میں بھی ہوتا ہے جو صرف ہندی زبان کی تعلیم سے متعلق ہوتا ہے۔ زبان کی تعلیم کے لئے وہ طریقہ کار بالکل بے کار ہوتا ہے جو جغرافیہ، تاریخ، حساب کے لئے ضروری ہوتا ہے پھر اردو کی حد تک تو یہ بات اور بھی اہم ہے۔ اردو زبان اپنی ساخت، امزاج، رسم الخط کی پیچیدگی ہر اعتبار سے بالکل جداگانہ طریقۂ تعلیم کی متقاضی ہے۔ مثلاً اردو میں س، ص، ث، الف، ع، ت، ط جیسے ہم صوتی حروف کا فرق سمجھانا، جوڑ اور ہجے کے لئے ایسا طریقہ اختیار کرنا کہ طالب علم کم سے کم وقت میں اس کو سمجھ لے یہ ایسے مسائل ہیں جو ہندی یا انگریزی ٹیچر کو پیش نہیں آتے یہ مسائل الگ ٹریننگ چاہتے ہیں اور زبان کے عام اصولوں سے ہٹ کر کچھ خاص اصول سکھانا پڑیں گے۔

ایسی صورت میں بی ٹی سی کی قید نہ صرف قحط الرجال کی وجہ سے بے کار ہے بلکہ اگر اردو مضمون کے ہائی اسکول کے ساتھ کچھ بی ٹی سی ٹرینڈ مدرسین مل بھی جائیں تو وہ اردو زبان کی تعلیم کے لئے ان ٹرینڈ ہی ہوں گے کیونکہ انھوں نے بی ٹی سی میں اردو زبان پڑھانے کا طریقہ نہیں سیکھا ہے۔

اس لئے ضرورت ہے کہ بی ٹی سی کی قید کو نرم کر دیا جائے اور اردو ٹیچروں کو سابقہ تجربے کی بنیاد پر مقرر کیا جائے۔ پھر دوسرے مرحلہ پر یا تو بی ٹی سی مدارس میں اردو کی تعلیم کا انتظام کیا جائے اور عملی کلاس میں بی ٹی سی کی ٹریننگ لینے والوں کو اردو پڑھانے کا موقع دیا جائے یا انسٹی ٹیوٹ آف ایلی منٹری ایجوکیشن میں اردو سیکشن کھول کر مختصر مدتی ٹریننگ کا انتظام کیا جائے، یا مجوزہ اردو اکیڈمی کے تحت اردو ٹیچرس ٹریننگ کالج قائم کئے جائیں یا الہ آباد شہر میں جو پرائیویٹ ادارہ اردو میڈیم مکاتب کے مدرسین کی تربیت کا انتظام کرتا ہے۔ اس کو تسلیم کر لیا جائے۔

آندھرا پردیش میں اردو پنڈت، تیلگو پنڈت اور انگریزی پنڈت کے نام سے پرائیویٹ منظور شدہ ادارے ان زبانوں کے ٹیچرس کی ٹریننگ کرتے ہیں۔ اس کورس کے ٹرینڈ مدرسین کسی جنرل ٹریننگ کے پابند نہیں ہوتے مگر جنرل ٹریننگ کے برابر گریڈ پاتے ہیں اور شرائط ملازمت بھی وہی ہوتی ہیں۔ اسی طرح کوئی معقول وجہ نہیں ہے کہ حکومت اتر پردیش اردو ٹیچرس کو بی ٹی سی کی ٹریننگ کا پابند کرے۔

حکومت کے ایجوکیشنل ایڈوائزرس اور محکمہ تعلیم کو فوراً اس طرف توجہ کرنا اور اس شرط کو ترمیم کرنا چاہئے ہرنئی اسکیم کی طرح اس نئی اردو تعلیم اسکیم کے لئے نئے طریقۂ کار اور غیر دفتری انداز کار کی ضرورت ہے۔ لہذا مناسب ہوگا کہ اس نئی اسکیم کو پرانی اسکیموں کے بنے تلے ضابطوں کی دھار پر ذبح نہ کیا جائے بلکہ اس کو تھوڑا سا غیر دفتری اور عملی انداز میں ابھرنے کا موقع دیا جائے۔ جب وہ کچھ جڑ پکڑ لے تو پھر ضابطہ بندی کی جا سکتی ہے۔

• ابوالفہیم وحید

اردو امریکن رپورٹر

۱۹۶۷ء میں ادارہ فروغ اردو شیب پور نے اردو زبان کی اہمیت کو واضح کرتے ہوئے امریکہ کے شعبۂ اطلاعات دہلی کو توجہ دلائی تھی کہ امریکن رپورٹر اردو میں بھی شائع ہونا چاہئے۔ مگر اس پر اس وقت کوئی توجہ نہیں دی گئی۔ جب دوسری درخواست کے ذریعہ ادارہ فروغ اردو نے پانچ سو سالانہ خریدار فراہم کرنے کا وعدہ کیا تو ایک خط کے ذریعہ اس کے ایڈیٹر حکیب سلون نے ہمارے خیالات سے اتفاق کیا۔

مسرت کی بات ہے کہ اب امریکن رپورٹر اردو میں شائع ہونے لگا ہے اردو داں طبقہ سے گذارش ہے کہ ایک روپیہ سالانہ چندہ کراس پوسٹل آرڈر کے ذریعہ سرکولیشن منیجر امریکن انفارمیشن سروس بہاول پور ہاؤس سکندرا روڈ نئی دہلی کے پتہ پر بھیج کر اس کے خریدار بنیں اور بنائیں۔

شیب پور۔ ایم۔ اے۔ قاسم (علیگ) سکریٹری

غالب کا خود نوشتہ دیوان

۲۰ راگست کے روزنامہ قومی جنگ رامپور میں غالب کے خود نوشتہ دیوان کے پاکستان اسمگل ہو جانے کا افسانہ پیش کیا گیا ہے ادب کی دنیا میں اس تجارتی بے ادبی کے نقشہ کو دیکھ کر فوری طور پر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ کس کے دامن پر کتنے داغ ہیں۔

یہ پیشہ عام ہے جو دیکھ کر لکھا جاتا ہے کلیم پوزر دوق ادبیں دچادوز ہرا خود سری کی دشواریوں کی عکاسی اقبال نے اس طرح کی ہے ؎

میں حسن ہوں کہ عشق سراپا گداز ہوں
کھلتا نہیں کہ ناز ہوں میں یا نیاز ہوں

پلکھنہ۔ • حسن عسکری پلکھنوی

▲

مترجم: برہم نانھ دت

رگوید X — ۱۲۷

رات

رات کی دیوی! اپنی تمام آنکھیں پھیلا کر کونے کونے میں پھیل گئی ہے۔

اس نے پوری طرح بناؤ سنگار سے آپنے آپ کو آراستہ کر لیا ہے۔

وہ غیر فانی ہے، اس نے ویرانوں کو ڈھانپ لیا ہے دیوی نے بلندیوں اور پستیوں کو محیط کر لیا ہے۔

اس نے آتے ہی تاریکیوں پر پورا پورا قابو پا لیا ہے۔

دیوی نے اپنی بہن شفق کی آمد پر اپنی گدی اس کے حوالے کر دی ہے۔

اور پھر تاریکی کہیں دکھائی نہیں دیتی۔

پرندوں کی طرح جنھوں نے اپنے گھونسلوں میں پناہ لے لی ہے ہم نے بھی وہی راہ اپنائی ہے۔

اس لئے اے دیوی آج کی رات ہم پر مہربان رہنا دیہاتی اپنے گھروں کو چل دئے، پرندے اور چوپائے بھی،

شکار کا شوقین شاہ باز بھی،

اے رات، بھیڑیوں اور مادہ بھیڑیوں سے ہمیں بچائے رکھنا، چوروں سے ہمیں پرے پرے رکھنا۔

تاکہ ہم تسکین سے رات کاٹ سکیں۔

جو تاریکیوں کو رنگینیوں سے مزین کر دیتی ہے۔ وہ واضح طور پر سامنے دکھائی دیتی ہے۔

اے نور کے تڑکے! تو اس پر قلم پھیر دینا، ادھار چکا دینا۔

اے رات زائیدہ نور! تعریف جو ایک فاتح کے شایان شان ہوتی ہے۔

تیرے حضور پیش کرتا ہوں، قبول فرمانا۔

"ہماری زبان"
کو مضامین و مراسلات ارسال کرتے وقت یہ خیال رہے کہ وہ کاغذ کے ایک طرف صاف تحریر کئے ہوئے ہوں۔ (ادارہ)

انجمن کی خبریں

جشنِ آزادی کا سالانہ طرحی مشاعرہ

دہلی پبلک لائبریری ہال میں انجمن ترقی اردو دلّی کے زیرِ اہتمام سالانہ طرحی بہاریہ مشاعرہ ہوا۔ مشاعرہ کی صدارت مرکزی وزیر امور مملکت جنرل شاہ نواز صاحب نے کی مشاعرے میں ملک کے ممتاز و نامور شعرائے کرام نے اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ کیا۔

• جنرل سکریٹری

جنگاؤں کے مدارس میں اردو جماعتوں کے قیام کا مطالبہ

جنگاؤں: محمد محبوب خاں معتمد انجمن ترقی اردو شاخ جنگاؤں نے اپنے ایک بیان میں بتایا کہ مستقر جنگاؤں و دیگر مواضعات موضع ملّوپلّی، مشتیال، پمبرتی گنڈلر گڈہ، جہاں اردو داں طلبہ کی کثیر تعداد موجود ہے ان مقامات پر اردو جماعتوں کا آغاز کر دیا گیا ہے لیکن تا حال مہتمم تعلیمات ورنگل سے منظوری کے احکامات وصول نہ ہونے پر طلبہ اور اولیائے طلبہ میں ایک عام بے چینی پائی جاتی ہے انھوں نے ارباب تعلیمات سے پر زور مطالبہ کیا ہے کہ فوری اردو جماعتوں کے قیام کے لئے احکامات اجرا کئے جائیں۔ مزید تاخیر طلبہ کے حق میں نہ ہوگی۔ انھوں نے مستقر جنگاؤں کی جونیر کالج میں اردو کی متوازی جماعتوں کے فوری قیام کی ارباب تعلیمات سے خواہش کی ہے۔

• سیاست حیدرآباد

رانچی میں شاندار یوم مطالبہ

رانچی: انجمن ترقی اردو (رانچی) کی جانب سے شاندار طور پر آزاد ہائی اسکول کے مرکزی ہال میں یوم مطالبہ منایا گیا۔

آزاد ہائی اسکول کے مرکزی ہال میں جناب مرتنجے گھٹک ایڈوکیٹ کی صدارت میں عوامی جلسہ انجمن ترقی اردو رانچی کے زیرِ اہتمام منعقد ہوا جس میں بلا تفریق مذہب وملت شہر اور بیرون شہر کے تمام سیاسی، سماجی، ادبی کارکنوں اور عوام نے شرکت کی۔

اس موقعہ پر جناب پروفیسر ابوذر عثمانی نے جلسہ کی غرض و غایت بیان کی۔ متعدد مقررین نے اردو کے ساتھ ناانصافیوں کا ذکر کیا اور اردو کا حق منوانے کے لئے انجمن کی تنظیم کو مضبوط بنا کر عملی اقدام کرنے کا مشورہ دیا۔

دوسرے روز اردو دوستوں کی ایک بڑی تعداد نے ڈپٹی کمشنر رانچی شری۔ آئی۔ سی۔ کمار کے دفتر کے سامنے زبردست مظاہرہ کیا۔ مظاہرین اپنے ہاتھوں میں تختیاں لئے تھے جن میں ان کے مطالبات اور نعرے درج تھے۔ پندرہ آدمیوں پر مشتمل ایک وفد ڈپٹی کمشنر سے ملا۔ وفد کی رہنمائی شری مرتنجے گھٹک، شری جھا، شری ابوذر عثمانی اور شری اسلم پرویز نے کی۔ وفد نے ریاستی انجمن ترقی اردو کی طرف سے جاری کردہ میمورنڈم کو پیش کیا۔

• اسلم پرویز سکریٹری

(باقی صفحہ ۱ سے آگے)

حاجی پور میں زیرِ صدارت علامہ ابوالمزاج صدیقی یوم مخدوم منایا گیا۔ نظامت کے فرائض کہانی کار ظہیر کیفی نے انجام دئے۔ کامریڈ سرفراز عثمانی نے مخدوم کی ادبی اور سیاسی زندگی اور مقبولیت اور جد وجہد کا بصیرت افروز انداز میں عوام کے سامنے تجزیہ پیش کیا۔ متعدد شعرائے کرام نے منظوم نذرانہ عقیدت پیش کیا اس کے بعد شعری اور نثری دور شروع ہوا ممتاز شعرائے کرام نے اپنا اپنا کلام سنایا اور نامور ادیبوں نے اپنی نثری تخلیقات پیش کیں۔ اس موقع پر جو منظوم خراج عقیدت پیش کیا گیا اس میں سے دو قطعات ہدیۂ قارئین ہیں۔

اے سراپائے عمل! اے رہنمائے انقلاب
اے عوامی رہنما! اے دولت ہندوستاں
یہ تو مانا آج اے مخدوم تو ہم میں نہیں
پھر بھی ہم تجھ کو سمجھتے ہیں امیر کارواں
(صوفی رفیق احمد آسی نقشبندی)

انقلابات کا طوفان لئے بہتی تھی
موج در موج خیالوں کی ترے گنگ و جمن
فلسفۂ شعر و سیاست، ادب و فکر جدید
ایک فانوس میں تھیں کتنی ہی شمعیں روشن
سجاد حسین غمگین

• کامریڈ سرفراز عثمانی

ہماری زبان
سے خط و کتابت کرتے وقت اپنے خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔
منیجر

اخبار و اذکار

اترپردیش کے تعلیمی اداروں میں اردو کو ختم کیا جا رہا ہے۔ یوپی کونسل میں ممبران کی شکایت!

لکھنؤ: یوپی کونسل میں شری ادم پرکاش نے ایک توجہ دلانے والی تحریک پیش کرتے ہوئے حکومت سے اردو کے سلسلہ میں اپنائی جانے والی پالیسی کی وضاحت کرنے کا مطالبہ کیا۔ اس تحریک میں کہا گیا تھا کہ اترپردیش میں اردو کو ہر طرح کا تحفظ و حوصلہ افزائی دینے کے اعلان کے باوجود مسلم انٹر کالج امارا (باغپت) ضلع میرٹھ انٹرمیڈیٹ کے درجات میں اس سال سے اردو کی تعلیم کا انتظام ختم کر دیا گیا ہے اس سے محبان اردو میں کافی بے چینی ہے جو ہائی اسکول سے اوپر کے درجوں میں اپنے بچوں کو تعلیم دلانا چاہتے ہیں۔

شری گوری شنکر رائے (سنڈیکیٹ کانگریس) نے کہا کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سرکار نے اپنے الیکشن جیتنے کے بعد اپنی اس پالیسی وغیرہ کو خیرباد کہہ دیا ہے کہ اردو کو اس کا حق ملنا چاہیئے۔

مسٹر صورت نرائن منی ترپاٹھی (حکمراں کانگریس) نے کہا کہ حکومت کسی کالج کو اردو پڑھانے کے لئے مجبور نہیں کر سکتی اردو کو ختم کر دینا کالج کی انتظامیہ کمیٹی کا مسئلہ ہے۔ سرکار سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔

شری شاکر علی صدیقی (سنڈیکیٹ) نے کہا کہ اردو پڑھنے والوں کے ساتھ یہ ایک جبری بے انصافی ہے۔ اردو کو تحفظ دینے کا سوال تو دور رہا جہاں اردو پڑھائی جارہی تھی وہاں سے بھی اردو کو ختم کیا جا رہا ہے۔ سرکار کی اسی دوغلی پالیسی کے خلاف بطور احتجاج واک آؤٹ کر رہا ہوں۔

مسٹر آغا زیدی (حکمراں کانگریس) نے حکومت کی اردو کے سلسلہ میں پالیسی کی تائید کرتے ہوئے کہا کہ اردو کو جو کچھ بھی دیا جائے اس کو قانونی شکل دے دی جائے تاکہ عمل درآمد میں کوئی رکاوٹ نہ ہو۔

مولانا عبدالرؤف (بی کے ڈی) نے تجویز کی تائید کرتے ہوئے کہا کہ سرکار نے اردو کے لئے جو وعدے بجٹ تقریر میں کئے تھے۔ اور وزیر اعلیٰ نے جو کتابچہ چھاپ کر اردو کے لئے وعدے کئے تھے اب ان کا عمل اس کے خلاف ہو رہا ہے۔

آخر میں ایوان کے لیڈر اور حکومت کانگریس کے اہم ستون شری بلدیو سنگھ آریہ نے کہا کہ سرکار کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔ کالج کو پرائیویٹ انتظامیہ چلاتا ہے وہی ذمہ دار ہے ہم ان کو اردو پڑھانے پر مجبور نہیں کر سکتے۔ اس پر کونسل کے چیرمین شری ویریندر سروپ نے اس نوٹس کو نامنظور کر دیا۔

• سیاست جدید کانپور

اردو تعلیم کے انتظام کا مطالبہ

فیض آباد: فیض آباد کے ممتاز شہریوں اور وکیلوں پر مشتمل سات آدمیوں کا ایک وفد جناب بھولا ناتھ سریواستو ایڈوکیٹ کی صدارت میں ساکیت ڈگری کالج فیض آباد کے سکریٹری جناب جواہر پرشاد اگروال سے ملا اور ان سے کالج کے بی۔ اے درجات میں دیگر مضامین کے ساتھ اردو کا مضمون پڑھائے جانے کا مطالبہ کیا۔ وفد نے جواہر پرشاد اگروال کو ایک میمورنڈم پیش کیا جس میں اردو ادب کو مالدار بنانے میں اردو علاقہ کی خدمات بیان کی گئیں اور یہ واضح کیا گیا کہ اردو زبان ہندوستانی ملے جلے کلچر کا نمونہ ہے اور وہ ہندوستان کے ثقافتی ورثہ کے تمام خط و خال کی نمائندگی کرتی ہے۔ وفد نے سکریٹری سے اپنے مطالبات میں اردو طلبہ کی مشکلات کا ذکر کیا جو موجودہ حالت میں اردو پڑھنے کے لئے دور کے مقامات جانے پر مجبور ہوتے ہیں یا اردو کے بجائے دوسرے مضمون کا انتخاب کرتے ہیں۔ سکریٹری موصوف نے وفد کے مطالبات کو ہمدردانہ سنا اور اردو کے مضمون کو بی اے کے درجات میں پڑھانے کا جلد انتظام کرنے کا وعدہ کیا۔

• سیاست جدید کانپور

اردو نمائندہ وفد کی لسانی اقلیتوں کے اسسٹنٹ کمشنر سے ملاقات

لسانی اقلیتوں کے اسسٹنٹ کمشنر جب بجنور تشریف لائے تو اردو تحفظ کمیٹی ضلع بجنور کی جانب سے محبان اردو ضلع بجنور کا ایک نمائندہ وفد محترم برجیس قدر صاحب و سلطان احمد خاں صاحب ایڈوکیٹ کی قیادت میں ملا۔

وفد نے اردو سے متعلقہ جملہ پریشانیوں کو زبانی طور پر افسران مذکور کے سامنے رکھا اور ایک مفصل میمورنڈم بھی پیش کیا۔ اس کے ساتھ ساتھ بجنور میونسپل بورڈ کے اردو ٹیچرس کے مسئلہ پر بھی آزادانہ ماحول میں جناب ارشد بجنوری نے گفتگو کی اور ایک میمورنڈم نمائندہ ٹیچرس (اردو) نے پیش کیا۔ کمشنر صاحب نے بڑی دلچسپی سے اردو کے متعلق شکایات سنیں اور ان کے ازالے کا وعدہ کیا۔

• مرزا شمیم اختر بیگ کنوینر اردو تحفظ کمیٹی

اردو میں یوم مخدوم

انجمن ترقی پسند مصنفین شاخ امروہہ کے زیر اہتمام عزا خانہ

(باقی صفحہ ۹ پر)

اسے خالص نقادوں سے دیا ہے۔ تنقید ایک ڈسپلن ہے، اس کے لئے ضبط و توازن کے ساتھ وسیع مطالعے، فنی نکات پر گہری نظر، زبان و اسالیب کے تکنیکی مسائل اور تخلیق سے ان کے رشتے کا عرفان ضروری ہے۔ اگر تنقیدی مضمون تخلیقی انشائیہ بن جائے تو جہاں ہماری عام خشک، بے رنگ اور تخلیق کے جوہر سے عاری تنقیدی نثر کے مقابلے میں زیادہ جاندار ہوگا، وہیں یہ اپنی اس تخلیقی شان کے باوجود تنقید کے ڈسپلن کا حق ادا کرنے میں ناکام بھی رہ سکتا ہے۔ ایک اور چیز جو ایسی صورت میں سامنے آتی ہے، وہ یہ کہ ہمارے بیشتر فنکار (جن میں شاعر اور فکشن نگار دونوں ہی شامل ہیں) تخلیق اور تنقید کی سطح پر کبھی کبھی متضاد باتیں کرتے ہیں۔ تخلیق اور نظریے (یا تنقید) کے درمیان یہ وسیع خلیج اس بات کی بھی غماز ہے کہ نظریات کو قبول کرنا تو آسان ہے مگر ان کا تخلیقی اظہار بہت دشوار ہے۔ تخلیق اور تنقید کی یہ دوئی اس طرف بھی اشارہ کرتی ہے کہ اگر خلیج بہت وسیع ہو تو دونوں میں سے ایک ادیب لادی یا اوڑھی ہوئی چیز ہے اور متضاد چیزوں میں ایک ہی حقیقی ہو سکتی ہے، تخلیق یا نظریہ؟ لیکن چونکہ ہمارے تخلیقی فنکار تنقید کے ڈسپلن کو معروضی انداز میں برتنے پر ابھی قادر نہیں، یا یہ اس کے مطالبات کو صحیح اہمیت نہیں دیتے اس لئے یہ بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ ان کی بظاہر متضاد تنقید و تخلیق میں در اصل حقیقی تضاد نہیں، بلکہ ظاہری تناقض ہے جس پر تخلیقی اظہار کے ریاض تجربے اور قدرت کے ساتھ تنقید کی زبان سے آشنائی و مہارت کے ذریعے قابو پایا جا سکتا ہے۔

میں نے 'ہماری زبان' میں پچھلا مضمون لکھتے ہوئے اس حقیقت کا ذکر کیا تھا کہ ہمارے یہاں صحیح معنی میں اب تک کوئی تنقیدی مکتب خیال پروان ہی نہیں چڑھ سکا۔ سماجیات، فلسفہ، تاریخ، نفسیات، معاشیات یا دوسرے علوم کے ماہرین ادبی تنقید کی طرف توجہ کریں تو یہ بھول جاتے ہیں کہ ادب خود باضابطہ اور مستقل بالذات علم ہے، اسی طرح جیسے طبیعیات، کیمیا، حیاتیات، سماجیات، معاشیات، تاریخ، نفسیات وغیرہ وہ ادب کو اپنے مخصوص شعبہ علم کی ثانوی شاخ سمجھ کر اسی انداز میں اس سے بحث کرتے ہیں۔ تنقید کی تحریری اور تقریری دونوں شکلوں میں اس کا اظہار ہوتا رہتا ہے۔ چنانچہ اس سمینار میں بھی ایسا ہوا، جو ناگزیر تھا۔ کچھ لوگ بعض غلط کتابوں کو اپنے مخصوص موضوع کی کتاب سمجھ لیتے ہیں جیسے ایک صاحب جو شیخ کسی یونیورسٹی میں ریڈر ہو گئے یہ سمجھ کر کہ دوسرے رسائل و کتب بیکار ہیں، صرف ریڈرز ڈائجسٹ (READERS' DIGEST) پڑھنے لگے، وہ سمجھے ہی ایک ایسا رسالہ ہے جو خاص طور پر یونیورسٹی کے ریڈروں کے لئے

نکالا جاتا ہے۔ اسی طرح ادب سے دلچسپی رکھنے یا اس پر رائے دینے والے بہت سے حضرات، ادب کو ایک علیحدہ علم وفن نہ مان کر اس کی تخلیقات کو اپنے مخصوص علم کی تصنیفات سمجھ لیتے ہیں۔ اس کی وجہ سے ادب کی حیثیت ثانوی ہو جاتی ہے اور دوسرے علوم کے نقطۂ نظر کو فوقیت مل جاتی ہے، جو ادب اور ادبی تنقید میں نامناسب ہے۔

ایسی ہی غلطی ہم ادب کو بعض "ٹوپیاں" پہنا کر بھی کرتے ہیں اور ادب کے پورے سراپا اور لباس کو نظر انداز کر دیتے ہیں، ایک لطیفہ ہے۔ ایک صاحب سے ان کے ایک بے تکلف دوست ملنے گئے، تو دندناتے ان کے ڈرائنگ روم میں داخل ہو گئے، دیکھا موصوف الف ننگے صوفے پر دھرے ہوئے ہیں، جسم پر لباس کے نام سے ایک تار بھی نہیں، مگر سر پہ ٹوپی لگی ہوئی ہے۔ دوست نے پوچھا "حضور جب آپ نے لباس کی ہر قید سے آزادی حاصل کر لی تو ٹوپی کیوں زیب سر فرمائی؟" جواب ملا "گھر میں تھا، اس لئے ننگا رہا، ٹوپی اس خیال سے پہن لی کہ شاید کوئی ملنے آ جائے۔" ادب میں سماجی مقصدیت بھی اسی طرح کی ٹوپی بن گئی ہے، کچھ حضرات اس طرف تو توجہ نہیں کرتے کہ ان کے فن کا پورا جسم ننگا ہے اس لئے کہ یہ ان کا ذاتی گھریلو معاملہ ہوتا ہے، مگر اس کے سر پہ سماجی مقصدیت کی ٹوپی ضرور منڈھ دیتے ہیں، کہ شاید کوئی ملنے آ جائے، ادب کی دوسری تمام شرائط کو نظر انداز کر کے محض سماجی مقصدیت پر زور دینا اسی طرح کا رویہ ہے۔

یہی حال ایک نئی ٹوپی کا ہے جسے 'جدیدیت' کہا جانے لگا ہے سماجی مقصدیت کی طرح اب یہ بھی ایک ٹوپی بن گئی ہے، اور بزعم خود جدید فنکار (شاعر اور افسانہ نگار دونوں) فن کے بدن کو آراستہ پیراستہ کرنے کے بجائے صرف جدیدیت کی ٹوپی اوڑھ کر سمجھ لیتے ہیں کہ انھیں فنکاروں کی صف اوّل میں اپنے ننگے بدن کے باوجود بٹھا لیا جائے گا۔

تنقید میں جب اصطلاحات پر اس انداز میں زور دیا جائے تو وہ بے معنی ہو جاتی ہیں، اس رویے کا اظہار کرنے والوں کو میر تقی میر کا ایک واقعہ شاید کچھ عبرت دلا سکے، روایت ہے کہ ایک صاحب مرزا مغل میر سے ملنے بڑی دور سے چل کر آئے نام سن کر ہی میر کی طبیعت میں انقباض پیدا ہوا، بڑی دیر بعد نکلے تو رسمی گفتگو کے بعد مرزا مغل نے میر صاحب سے کچھ اشعار سنانے کی فرمائش کی۔ میر صاحب نے بغور انھیں دیکھا اور کہا "میں آپ کو شعر سنا کر اپنا اور خود آپ کا وقت ضائع کرنا نہیں چاہتا، کیونکہ آپ کے بشرے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ آپ شعر نہ سمجھ سکیں گے۔"

آج کے جمہوری دور میں میر صاحب کا رویہ جاگیردارانہ اور غیر جمہوری سمجھا جائے گا، لیکن اگر واقعی جمہوریت کے کچھ آداب

(باقی صفحہ ۱۲ پر)

وحید اختر

میرا صفحہ

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے زیرِ اہتمام ۲۷، ۲۸ اور ۲۹ اگست کو فکشن (ناول اور افسانہ) کے مسائل پر ایک سیمینار منعقد کیا گیا۔ عام طور سے ہم عصر ادب اور اس کے مسائل یونیورسٹیوں کے اردو شعبوں میں شجرِ ممنوعہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ علی گڑھ کو اس لحاظ سے امتیاز حاصل ہے کہ یہاں جدیدیت پر بھی پہلی بار سیمینار ہوا اور اب ناول و افسانہ پر بھی سیمینار منعقد کیا گیا جس میں فکشن کے عمومی مسائل، عالمی معیار، اور مغربی نظریات و تخلیقات پر بھی مقالے پڑھے گئے اور بحثیں ہوئیں اور اس کے ساتھ زیادہ توجہ اردو ناول و افسانہ پر دی گئی۔ ہم عصر فکشن خصوصیت سے بحث کا موضوع رہا۔ اس سلسلے میں خود کئی اہم جدید افسانہ نگاروں نے اپنے خیالات بھی پیش کیے۔

ہمارے فکشن لکھنے والوں کو نقادوں سے یہ شکایت رہی ہے کہ اردو تنقید کی ساری توجہ شاعری پر رہی ہے، فکشن پر کم توجہ دی گئی۔ یہ شکایت بجا ہے لیکن اگر ہم مغربی تنقید کو بھی دیکھیں تو پتہ چلے گا کہ وہاں بھی آج تک بحث کا بڑا موضوع شاعری ہی ہے۔ اس کا ایک سبب تو یہ ہو سکتا ہے کہ مغرب کے کئی اہم ناقدین خود شاعر رہے ہیں۔ دوسرے یہ کہ شاعری کی روایات ہزاروں برسوں پر محیط ہیں جبکہ فکشن کی عمر نسبتاً بہت کم ہے۔ شاعری انسانی تہذیب کا اس وقت لازمہ سمجھی جاتی رہی کہ جب صدیوں میں سائنس اور ٹکنالوجی کو یہ عروج سے قبل تک انسانیاتی علوم جن میں ادب کو بلند مقام حاصل تھا، کا غلبہ رہا ہے۔ نثر کا ارتقا بھی بعد میں ہوا اور فکشن کو حقیقی اہمیت اسی صدی میں حاصل ہوئی، جبکہ ناول کو موجودہ عہد کا رزمیہ سمجھا جانے لگا۔ پیچیدہ معاشرت و کائنات میں انسانی وجود، اس کے رشتوں اور مسائل سے لے کر انسان کی داخلی واردات و تجربات تک کا احاطہ کرتا ہے۔ اردو میں تو ناول کا ارتقا دورِ جدید میں ہوا۔ اب بھی ہمارے یہاں اچھے ناول انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔ البتہ اردو افسانے کو ترقی پسند تحریک سے قبل ہی فروغ حاصل ہو چکا تھا جسے اس تحریک نے بھی ترقی دی اور آزادی کے بعد کے لکھنے والوں نے اسے نئی جہات و ابعاد سے روشناس کرایا۔ جدید تنقید میں شاعر نقادوں نے صرف نظریات کے مباحث ہی میں نہیں بلکہ عملی تنقید میں بھی اب تک زیادہ نمایاں حصہ لیا ہے حالانکہ شاعر نقادوں نے بھی ناول اور افسانے کو نظر انداز نہیں کیا۔ لیکن فطری طور پر ان کی توجہ شاعری اور اس کے مسائل پر زیادہ رہی ہے۔ اس سیمینار کی سب سے بڑی دین یہ ہے کہ پہلی بار کئی افسانہ نگاروں نے سنجیدگی سے افسانہ اور ناول کے مسائل پر سوچا، لکھا اور بحث کا آغاز کیا۔ اس طرح اس صنف کے تخلیقی فنکاروں نے اپنی صنف کی تنقید کی طرف توجہ کر کے اردو تنقید کو ایک نئی جہت سے روشناس کیا۔ شاعری اہم ہے یا فکشن، یہ بحث اس لیے بے معنی ہے کہ میرے نزدیک ادب کی اصناف ہی نہیں بلکہ تمام فنونِ لطیفہ یکساں طور پر قابلِ قدر ہیں، اور اعلیٰ سطح پر سب ایک ہو جاتے ہیں۔

اس سیمینار میں متعدد ترقی پسند افسانہ نگاروں کو بھی مدعو کیا گیا تھا جیسے راجندر سنگھ بیدی اور قرۃ العین حیدر، مگر یہ لوگ نہ آسکے۔ پرانے لکھنے والوں میں صرف حیات اللہ انصاری آئے اور وہ بھی آخری دن آخری اجلاس میں۔ ان فنکاروں کی غیر موجودگی اور نئے لکھنے والوں کی شرکت سے ایک رائے یہ بھی قائم کی جا سکتی ہے کہ شاید اس وقت ادب اور اس کے مسائل کو نئے لکھنے والے ہی زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ پرانے لکھنے والے تو اپنی زندگی کے روزمرہ مسائل و معاملات میں اس قدر الجھ گئے ہیں کہ ادب ان کے لیے ثانوی چیز بن گیا ہے۔ خدا کرے ایسا نہ ہو بلکہ واقعی مجبوریوں نے انھیں اس منفرد سیمینار میں شرکت سے باز رکھا ہو۔

سیمینار مجموعی حیثیت سے بہت کامیاب رہا۔ مختلف نقطہ ہائے نظر سامنے آئے، سنجیدہ بحثیں ہوئیں، علمی انداز میں بھی اور تخلیقی فنکاروں کے موضوعی (SUBJECTIVE) اور خود نگری کے لہجے میں بھی کچھ گرما گرم باتیں ہوئیں۔ ایسے مقالے بھی پڑھے گئے جن کا انداز معروضی، علمی اور تجزیاتی تھا اور ایسے مضامین بھی پڑھے گئے جن کا لہجہ ذاتی، جذباتی اور تخلیقی انشائیے کی شان لیے ہوئے تھا۔ لیکن ان دوسرے قسم کے مضامین کی اہمیت اس لیے ہے کہ ان سے ہمیں افسانہ نگاروں کے سوچنے کے طریقے، اور اپنے مسائل کو اپنی نظر سے دیکھنے کے رجحان اور تخلیقی عمل کی داخلی پیچیدگیوں کو سمجھنے میں مدد ملی۔

میں نے اپنے مضمون (تخلیق اور تنقید) میں اس طرف اشارہ کیا تھا کہ جہاں آج کی تنقید خالص سکہ بند پیشہ ور نقادوں کی گرفت سے نکل کر فنکاروں کے منصب کا جز بن چکی ہے (جو ایک نیک فال ہے) میں نے کہا اسی طرح تنقید میکانکیت سے آزاد ہو کر تخلیق کی ہم قدم ہو سکتی ہے، تاہم اس تنقید کے خطرات بھی ہیں جن میں سے دو خصوصیت سے توجہ طلب ہیں۔ ایک تو یہ کہ فنکار نقاد اپنے ذاتی انفرادی تجربے کو ہی تنقید کی اساس بنائے تو تنقید کی معروضیت (OBJECTIVITY) ختم ہو سکتی ہے۔ دوسرے یہ کہ فنکار نقاد اپنے تصورِ فن کی بنا پر کلیہ سازی اور فارمولا بازی کا شکار ہو جائے تو وہ بھی اسی جرم کا مرتکب ہوگا جس کی شکایت

(باقی ۱۱ پر)

مالک انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ، پرنٹر و پبلشر سید تفضل حسین ایم اے نے لیتھو کلر پرنٹرس علی گڑھ میں چھپوایا اور دفتر مرکزی انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ سے شائع کیا
REGD. NO. L. 922　　فون نمبر ۲۹　　R. No. 2166/57